۱۸ویں صدی میں اردو لغت وقواعد نویسی اور برصغیر کا لسانی منظر نامہ

ساجد جاوید*

ڈاکٹر روبینہ ترین**

Abstract:

Eighteenth century is a story of the declination of Mughal empire and official language Persian in Hindustan.The Europeans and Urdu(the then Hindustani language)were going to replace the Mughals and Persian respectively.The local community of hindustan was adopting the local language Urdu rapidly.This language was the lingua franca at that time.The orientalists also contributed and strenghthened the language in the form of compiling grammars and dictionaries of hindustanee(urdu) language.This article presents the linguistic study of eighteenth century Hindustan.

اٹھارہویں صدی اردو زبان اور ادب کے لئے ایک اہم دور سے تعبیر کی جاتی ہے۔اس صدی نے سیاسی طور پر فارسی زبان اور مغل حکمرانوں کو زوال کے رستے پر دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔سرکاری زبان فارسی کے زوال

* استاد شعبہ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

** صدر شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

سے ایک خلا بننا شروع ہوا تو مقامی زبانوں کو اس خلا کو پر کرنے کا موقع میسر آیا۔اس صدی کے شروع میں ہندوستانی زبان (اردو/ہندی) گھٹنوں چلنا شروع کر چکی تھی۔اس ہندوستانی زبان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ عوام کے ساتھ ساتھ یہ زبان مغل دربار میں کثرت سے بول جانے لگی تھی،اس کے باوجود فارسی زبان کو بہرحال ابھی تک سٹیٹس سمبل سمجھا جاتا تھا جبکہ ہندوستانی زبان مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے جانی جاتی تھی۔اس صدی میں شمال اور دکن کے علاقوں پر الگ الگ حکومتیں موجود تھیں۔دکن کی پانچوں آزاد اور خود مختار ریاستیں ہر معاملے میں شمال کے بر خلاف،مرکز گریز پالیسیوں پر عمل پیرا تھیں۔یہ اختلافات مذہب اور سرکاری زبان کے انتخاب میں زیادہ واضح ہوا۔دکن کی تمام ریاستوں میں مقامی دکنی زبان (ہندوستانی/اردو/ہندی) کو سرکاری زبان کے منصب پر فائض کیا گیا جو دکنی حکمرانوں کی شمالی ہند سے بغاوت کی نشان دہی کرتی ہے۔دکنی زبان کی سرکاری سرپرستی نے ہی دکنی ریاستوں میں اردو ادب کی تمام کلاسیکی شعری اصناف کی روایت کے لئے عملی کاوشوں کی راہ ہموار کی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی مقاصد سے بڑھ کر اس سرزمین پر حکمرانی کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کر دیا تھا۔اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل حکمرانوں کو دام میں لانا مشکل نہ ہوا۔انگریزوں نے مستقبل میں حکمرانی کے منصوبے کے تحت ایسی 'لنگوافرینکا' تلاش کرنا چاہی جو نہ صرف عوام وخواص کے ساتھ رابطے کا کام دے بلکہ فارسی کی جگہ بھی اپنا لے۔چنانچہ انہوں نے اردو زبان کو اپنے مقاصد کی انجام دہی کے لئے موزوں خیال کیا۔اس دور میں نو وارد غیر ملکیوں کے لئے اس زبان کا سیکھنا ضروری خیال کیا گیا لیکن اس زبان کی تحصیل کے لئے معاون کتب موجود نہ تھیں۔اہلِ ہند کو چونکہ اردو سیکھنا مشکل نہ تھا،اس لیے ہندوستان میں اردو لغت اور قواعد کو مرتب کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔چنانچہ مختلف یورپی افراد نے ہندوستانی زبان میں لغات اور قواعد کی کتب کو مرتب کرنے کی کاوشیں شروع کیں۔

اس عہد میں مشرقی زبان وادب کی روایت میں گو زبان کے حوالے سے کتب مرتب کرنے کا رجحان زیادہ قوی نہ تھا،لیکن ہندوستانی زبان کے ادبی ولسانی روپ میں بڑی توانا تبدیلیاں محسوس کی جا رہی تھیں۔ ہندوستانی زبان کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے۔سترہویں صدی کے وسط تک 'ہندوستانی زبان' عوامی سطح پر بول چال کی زبان بن چکی تھی۔ مغلوں کے اس عہد تک مغربی اقوام کی ہندوستان میں آمدورفت شروع ہوگئی تھی۔یہ لوگ فرانس، پرتگال، برطانیہ وغیرہ سے تجارتی مقاصد کی خاطر آئے تھے۔برصغیر کے حکمرانوں کی کمزوری نے ان کے لیے اس علاقے میں دلچسپی پیدا کی چنانچہ مذہبی، سیاسی وتجارتی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مقامی زبان بھی وسیلہ بنی۔ مغربی تاجروں،عیسائی مبلغوں نے اردو زبان کو Moors زبان کا نام بھی دیا۔جس کا مطلب تھا مسلمانوں

کی زبان (اردو)۔ شاہ جہانی عہد تک آتے آتے اس نئی زبان کا چلن اتنا بڑھ گیا تھا کہ سرکار کے دربار سے لے کر ہندوستانی عوام کی بول چال کے لیے اردو زبان ایک خاص مقام حاصل کر چکی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ء) کے عہد کے بعد ولی دکنی کے دیوان نے، جو کہ مقامی دکنی زبان میں مرتب کیا گیا تھا، نے شمالی ہندوستان کے فارسی ادب کی روایت کے مقابل اردو کو مقبول عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں یہ دیوان دہلی اور گرد و نواح میں اردو ادبیات کی ترویج ونشو ونما کے لیے بارش کا پہلا کارآمد قطرہ ثابت ہوا۔

دراصل ۱۷۰۰ء میں ولی دکنی نے جب دہلی کا سفر اختیار کیا تو اس کے لیے یہ عجیب بات تھی کہ یہاں فارسی کے علاوہ کسی مقامی زبان میں ادب تخلیق کرنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ولی کی توجہ مقامی زبانوں کو فارسی زبان کے مقابل پیش کرنے کے لیے ایک نئے شعری اسلوب کی طرف ہوگئی۔ تاریخ میں شاہ سعد اللہ گلشن کا ولی کو ریختہ گوئی کا مشورہ بھی اسی تناظر میں ہے۔ ولی کے عہد کی زبان کا لسانی جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس دَور میں عربی اور فارسی کے الفاظ دکنی میں شامل ہو چکے تھے اس کے ساتھ ساتھ مقامی پنجابی، دکنی و دراوڑی الفاظ کی موجودگی سے یہ نمونہ سامنے آیا، جو نیم پختہ روپ بن کر سامنے آیا۔ ولی کی اس زبان میں پراکرتی عنصر اور عربی فارسی آہنگ باہم آمیخت ہوتا نظر نہیں آتا ابھی یہ ملغوبہ ایک جان بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ ایک ایسا روپ سامنے آیا جسے عوامی سطح پر پذیرائی ملی اور خواص نے بھی اس میں زیادہ مین میخ نہیں نکالی۔ اس کی پذیرائی کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ یہ زبان شاہجہانی عہد میں مستعمل تھی اور رابطے کی زبان بن چکی تھی۔ شاہجہانی عہد میں یہ ہندوستانی مستند ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ولی کا کلام شمالی ہندوستان کے عوامی لب ولہجہ سے زیادہ مختلف نہیں تھا، اسی لیے اسے مقبول ہونے میں دیر نہ لگی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں شمال میں فارسی زبان 'بول چال' کے حوالے سے ایک معیار کا درجہ رکھتی تھی ۔ یہ اس لیے بھی تھا کہ لوگوں کی سرکار دربار تک رسائی آسان ہو اور ان کی ترقی میں زبان کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اس عہد میں فارسی زبان بولنا سمجھنا ایک سٹیٹس سمبل تھا۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ ہر سرکاری افسر و ملازم کا فارسی زبان سیکھنا اس لیے بھی ضروری تھی کہ بادشاہ سے بات چیت میں آسانی رہے۔ مقامی ادبی روایت میں کہیں کہیں اردو کی کوئی غزل یا شعر پارہ بھی سنائی دے جاتا تھا۔ مثلاً عبدالقادر بیدل کی اردو غزل۔ اب عوام کے ساتھ ساتھ شعراء بھی اردو زبان کی طرف مائل ہونا شروع ہوئے۔ محی الدین قادری زور اس عہد کے لسانی مزاج کو اس طرح دیکھتے ہیں۔

''(شمالی ہند کے) فارسی شاعروں نے جب دیکھا کہ دکن میں اردو شعر گوئی کا ذوق

ترقی کر چکا ہے اور وہاں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں تو وہ شوق سے دکنی ادب کی طرف بڑھنے لگے۔اور چونکہ اس اثناء میں فارسی شاعری سے اکتا گئے تھے،ایک غیر ملکی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے انھیں کافی محنتیں کرنا پڑتی تھیں اوراس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں کے مقابلے میں اپنے تئیں کمزور پاتے تھے۔۔۔دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔۔۔تو انہوں نے فارسی کو ترک کرنا شروع کیا۔یہ بیزاری اس حد تک پہنچی کہ جب سودا یا میر جیسا بڑا شاعر فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے رتبہ سے اتر کر یہ کام کر رہے ہیں۔''(۱)

مغربی اقوام کا ہندوستان میں ورود اٹھارہویں صدی سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔واسکوڈے گاما نے ۱۴۹۸ء میں یورپی اقوام کو برصغیر کا راستہ دکھایا۔نتیجے میں ۱۵۴۰ء تک کے عرصے میں یورپ کی پرتگالی قوم نے ہندوستان کی بہت سی بندرگاہوں پر قدم جمانا شروع کر دیے تھے۔یہ اقوام بغرض تجارت برصغیر میں وارد ہوئیں۔ پرتگالی قوم نے ہی پہلی مرتبہ ہندوستانی زبان (اردو) کو یورپ میں متعارف کرایا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پرتگالیوں کا اس عہد کے یورپ پر کافی تسلط اور سیاسی تفوق موجود تھا۔پرتگالی قوم کے بعد فرانسیسی اور پھر انگریز قوم نے برصغیر کی زمین پر اپنا مسکن بنانا شروع کیا۔نو وارد اقوام کو مقامی آبادی اشرافیہ اور سرکار دربار تک رسائی کے لیے لازمی طور پر فارسی، ہندوستانی زبان سے واسطہ پڑا ہوگا۔ پرتگالی زبان نے برصغیر کی بولیوں اور زبانوں پر بطور خاص اثر ڈالا۔اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں پرتگالی الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔آج کی اردو میں پرتگالی کے کثیر الفاظ اپنی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد لکھتی ہیں:۔

''پرتگالی کا اثر تمام ہندوستانی زبانوں پر پڑا،خصوصا جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں اور مرہٹی، بنگالی، آسامی زبانوں پر پرتگالی کے اثرات نہایت گہرے ہوئے۔اسی طرح اردو بھی پرتگالی سے متاثر ہوئی۔بہت سے پرتگالی الفاظ آج بھی اردو میں بے تکلف بولے جاتے ہیں اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ پرتگالی ہیں''۔(۲)

ہندوستان میں سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے شروع تک جتنے لوگ تاجر، پادری یا سفیر کے طور پر ہندوستان آئے،انہوں نے سب سے پہلے مقامی زبانیں سیکھنے پر خاص توجہ دی۔سنسکرت، پراکرت، فارسی،عربی اور ان سب کے ساتھ عوامی لنگوافرینکا یعنی ہندوستانی زبان بھی اس دور میں سیکھنے جانے کا رجحان پیدا ہوا۔ہندوستان کی تین بڑی پریذیڈنسیوں مدراس،کلکتہ اور بمبئی میں اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ فارسی اور ہندوستانی زبان،نو وارد مغربی افراد کو سکھائی جائے،تا کہ سرکار دربار سے معاملات طے کرنے میں آسانی رہے۔مستشرقین اور(کمپنی کے) مغربی افراد نے اول اول 'ہندوستانی زبان' کو اس لیے اختیار کیا کہ تجارت کے لیے یہ زبان ضروری

تھی۔ دوسرا اس زبان کی تحصیل وتدریس سے اپنے سیٹ اپ میں مقامی لوگوں کو کھپانا نسبتاً آسان ہو گیا تھا۔ چنانچہ مقامی آبادی کو نوکرر کھنے اوران سے پوری طرح کام لینے کے لیے مقامی زبانوں کا علم بڑا ممد ومعاون ثابت ہوا۔

اس عہد کی لسانی وادبی صورتِ حال یوں واضح ہوتی ہے کہ اس عہد میں (اٹھارہویں صدی) فارسی وعجمی تہذیب ثانوی اور مقامی اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب اولین سطح پر آنا شروع کر دیتی ہے۔اہم بات یہ ہے کہ اس تہذیب کا رخ عوام کی طرف مڑتا چلا گیا جو کبھی صرف اشرافیہ کے لیے ہی مخصوص تھی۔اشرافیہ کی فارسی وعجمی تہذیب زوال کی طرف جانا شروع ہوگئی۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں:

> ''علم وادب جواب تک فارسی زبان کے تعلق سے خواص کی جاگیر تھا،نئی زبان کے ابھرنے اور اہمیت اختیار کرنے کے ساتھ ہی عوام بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔اور فارسی زبان،اس کا ادب اوراس کے اسالیب واضاف اس نئی وادبی زبان میں جذب ہونے لگتے ہیں۔شمالی ہند میں اٹھارویں صدی سے پہلے اردو زبان میں لکھنا،کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔لیکن اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی اردو زبان نہ صرف فارسی کی جگہ لے لیتی ہے بلکہ ادبی زبان بن کر برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔اردو زبان کی فتح دراصل عوام کی فتح تھی،جس میں ہر مذہب وعقیدے کے لوگ شریک تھے۔جب انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا تو اردو کو نہ صرف ہندو مسلمان ایک ساتھ استعمال کر رہے تھے،بلکہ معاشرت کی جڑوں تک پہنچنے کے لئے خود انگریز بھی اس زبان کو سیکھ کر وسیلۂ ابلاغ بنا رہے تھے۔(۳)

ولی کے دیوان کی آمد کا غلغلہ مدھم ہوا تو ایہام گوئی کی مشق نے اردو شعرا کو زبان کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ولی کے دیوان کی دہلی آمد کے مابعد اثرات کے تحت اصلاح زبان وسخن کی جو تحریک چلی اس نے میر ومرزا کی جدید اردو روپ ہموار کرنے میں بڑی معاونت کی۔ولی سے میر ومرزا تک کے عہد کو البتہ،اصلاح زبان کا دوسرا دَور شمار کیا جانا چاہیے۔(۴) اس اصلاح کے دَور سے اردو کی وہ صورت سامنے آئی جو آج کی اردو کی شکل میں ملتی ہے۔اصلاح زبان کے دَور میں شاہ حاتم،مرزا مظہر،خاں آرزو اوران کے بہت سے شاگردوں کا ایک ایسا کردار سامنے آتا ہے جس سے ہندوستانی زبان پراکرتی عناصر کو،مقامی اور دکنی محاورات والفاظ کو قلمزد کرتے ہوئے عربی فارسی تراکیب والفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دیتی چلی گئی۔۔شمالی ہند میں تلاشِ لفظِ تازہ کی تحریک،ایہام گوئی،صاف گوئی اور ردِ عمل کی تحریکوں نے اردو زبان کے موجودہ روپ میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔عجیب بات ہے کہ اس عہد کے مسلم شعراء نے مقامی ہندی،دکنی الفاظ کی ایک لسٹ یوں مردود قرار دے کر ٹکسال سے نکال باہر کی کہ اصلاحِ زبانِ اردو کا یہ عمل ملک بھر میں غیر معمولی طور پر محسوس کیا گیا۔

اصلاح زبان کا یہ عمل محسوس کیا جانا فطری تھا، کیوں کہ زبان کے روپ میں یہ تبدیلیاں غیر فطری انداز میں وقوع پذیر تھیں۔ اردو شعرا نے اردو زبان کو فصیح و بلیغ بنانے کے لئے عربی و فارسی زبانوں سے خوشہ چینی شروع کر دی۔ اس ضمن میں نزاعی مباحث کسی ایسے محقق کی راہ تک رہے ہیں جو معروضی طور پر اصلاحِ زبان کے اس عمل کی تحقیقی جہات کو سامنے لا سکے۔ شاہ حاتم مرزا مظہر جان جاناں، خان آرزو، میر و سودا کے عہد تک واضح طور پر اردو زبان میں فرق دیکھا جا سکتا ہے جو ولی کی دکنی اردو سے بہت حد تک علیحدہ ہے۔ اردو زبان میں عربی فارسی الفاظ و تراکیب اور محاورے کو ترجمہ کر کے اور کہیں بالکل اسی حالت میں لے کر شامل کیا گیا۔ آنے والے عہد میں اگر اردو ہندی کا مورخ اور محقق تنازعات کی جڑیں تلاش کرے گا تو وہ اس عہد میں کافی دیر کار رہے گا اور معروضی طور پر بتائے گا کہ اس عہد میں اردو زبان کے روپ میں عربی فارسی تبدیلیاں کیا فطری تھیں یا غیر فطری؟

مرزا مظہر جانِ جاناں کے ہاں سب سے پہلے زبان کی اصلاح کا شوق نظر آتا ہے۔ اصلاح کا ایک پہلو طبعیت کا تصوف کی طرف مائل ہونا اور دوسرا پہلو مغلوں کے زوال (عجمی زوال) کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ مرزا صاحب کو اس زوال کی بڑی فکر تھی۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ ان کو ان سے زیادہ دھن کا پکا شاگرد ''انعام اللہ خاں یقین'' کی صورت میسر ہوا، جس کے خون میں مجددیت شامل تھی (مجدد الف ثانی کے نواسے تھے)۔ اردو سے ہندی اثر زائل کرنا انہیں مذہبی فریضہ نظر آیا۔ چنانچہ اردو زبان کو ان مصلحین کی اصلاح کے مذہبی فریضے سے گزرنا پڑا۔ یہ عمل سودا کے عہد سے ہوتا ہوا ناسخ کے عہد تک پہنچا تو ناسخ کے ہاتھوں اردو زبان کی وہ گت بنی کہ امام بخش ناسخ (لکھنو) کے اصلاح کے عمل کو متشددانہ سمجھا گیا۔ ناسخ کے غضب کا شکار، بے چاری اردو زبان کو ان الفاظ سے ہاتھ دھونا پڑے جو فطری انداز سے اردو زبان میں رچ بس گئے تھے۔ یہ زبان لکھنو کے پر تکلف زبان کے آراستہ و پیراستہ روپ کو پیش کرتی ہے۔

اٹھارہویں صدی میں مقامی افراد کی جانب سے مقامی زبانوں کی لغت اور قواعد نویسی کے مرتب کرنے کی طرف زیادہ عملی اقدامات نہیں کیے گئے۔ لغت نویسی کی ضرورت یوں بھی محسوس نہیں کی گئی کہ ابھی ہندوستانی زبان ترقی کے اس خاص معیار تک نہیں پہنچی تھی کہ اسے سرکار دربار اور نثر و شعر کی زبان بنایا جا سکے۔ ایک اہم عنصر یہ بھی تھا کہ یہ ہندوستانی زبان عوامی سطح پر بول چال کا کام انجام دے رہی تھی اس لیے یہ زبان سیکھنا اہم کام نہیں تھا۔ مغربی افراد نے چونکہ مقامی زبانوں کو نئے سرے سے غیر ملکی کے طور پر سیکھنا تھا اس لیے اس زبان اور دوسری زبانوں کی لغات اور قواعد لکھنے کی طرف خاص توجہ کی گئی۔

اٹھارہویں صدی میں دوسری طرف مقامی روایت دیکھی جائے جس نے لسانی منظر نامے میں دیرپا

اثرات مرتب کیے تو یہ امر سامنے آتا ہے کہ مقامی زبانوں کی لغت اور قواعد نویسی کی طرف زیادہ عملی اقدامات نہیں کیے گئے۔ لغت نویسی کی ضرورت یوں بھی محسوس نہیں کی گئی کہ ابھی ہندوستانی زبان ترقی کے اس خاص معیار تک نہیں پہنچی تھی کہ اسے سرکار دربار اور نثر وشعر کی زبان بنایا جا سکے۔ ایک اہم عنصر یہ بھی تھا کہ یہ ہندوستانی زبان عوامی سطح پر بول چال کا کام انجام دے رہی تھی اس لیے یہ زبان سیکھنا اہم کام نہیں تھا۔ مغربی افراد نے چونکہ مقامی زبانوں کو نئے سرے سے غیر ملکی کے طور پر سیکھنا تھا اس لیے اس زبان اور دوسری زبانوں کی لغات اور قواعد لکھنے کی طرف خاص توجہ کی گئی۔

مولانا عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' کو کسی مقامی ادیب کی طرف سے لکھی جانے والی پہلی لغت تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب اردو فارسی زبانوں کے الفاظ ومترادفات تفہیم کے لئے لکھی گئی۔ گو روایت میں امیر خسرو کی 'خالق باری' کے ساتھ دوسرے منظوم لغت نامے بھی ملتے ہیں، لیکن یہ لغت اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے۔ یہ لغت طالب علم کی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی تھی، اس لئے اس کو آج کے لغت نویسی کے معیارات پر نہیں پرکھا جانا چاہئیے۔ ملا عبدالواسع ہانسوی عالمگیری عہد کے عالم تھے۔ اسے اردو کی پہلی باقاعدہ اردو، فارسی لغت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ رام بابو سکسینہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قریب قریب عالمگیر کے زمانے میں اہل ہندوستان کو اردو لغات کی ترتیب وتدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبدالواسع ہانسوی نے (جن کی قواعد فارسی اور گلستان و بوستان کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالمگیر کے زمانے میں اردو، ہندی الفاظ کی یک لغت مدون کی اور اس کا نام غرائب اللغات رکھا۔ اردو الفاظ کے معنے فارسی میں لکھے۔ ایک عرصے بعد سراج الدین علی خان آرزو نے اس کی نظر ثانی کی۔ بہت سے الفاظ اور معنی میں اضافے کیے۔ غلطیاں درست کیں اور اسے ''نوادر الالفاظ'' کے نام سے موسوم کیا''۔ (۵)

عبدالواسع ہانسوی کی یہ کاوش بتاتی ہے کہ اس عہد میں گو عوامی بول چال کے لیے فرہنگوں یا ڈکشنریوں کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی لیکن طالب علم کو عوامی سطح سے بلند کرنے اور بلند خیال کرتے ہوئے اس کی تدریس زبان کے لیے لغات لکھی جا رہی تھیں۔ آنے والے عہد میں مستشرقین نے اسی انداز کی لغات لکھیں جن کا مقصد نئے سیکھنے والوں کے لئے معنی بتانا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُن کے پاس لغات کی پوری روایت موجود تھی، لیکن مشرق میں ابھی اس طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔

سراج الدین علی خان آرزو (وفات ۱۷۵۶) اٹھارہویں صدی میں لسانیات کا شعور رکھنے والے ادیب گزرے ہیں۔ شاعری میں ان کی حیثیت سے قطع نظر، زبان ولسانیات کے حوالے سے ان کی شعوری کاوشیں ''نوادر

الالفاظ''، ''سراج اللغات'' اور ''مثمر'' کی صورت میں منظرِ عام پر آئیں۔ خان آرزو کے عہد میں ابھی زبان ہندوستان اور دوسری مقامی زبانوں پر تحقیقی کام کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ خاں آرزو سے کچھ تسامحات بھی ہوئے جب انہوں نے دو مختلف خاندانوں کی زبانوں، عربی (سامی خاندان) اور سنسکرت (آریائی خاندان) کو، تقابلی انداز میں یوں دیکھا کہ ان میں لسانی مشابہت اکٹھی کرنے لگ گئے۔ یہ وہی عہد ہے جب ولیم جونز (قریب قریب) برصغیر میں سنسکرت پر تحقیق کر رہا تھا۔ ولیم جونز ایک بہترین مستشرق تھا جو مغرب کی بڑی زبانوں لاطینی، یونانی وغیرہ اور سنسکرت پر اس انداز میں تحقیق کر رہا تھا کہ ان کا آغاز کسی ایک زبان یا خاندان سے ثابت کیا جا سکے۔ ولیم جونز کے ہندوستان آنے سے قبل خان آرزو فارسی اور سنسکرت زبانوں میں مماثلتیں تلاش کرنے کا آغاز کر چکے تھے۔ یہ کاوشیں اگر بعد میں زیادہ معیاری نہ بھی ثابت ہوئی ہوں تب بھی آرزو کا اس میدان میں عملی رجحان ایک اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نوادرالالفاظ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''آرزو کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد رکھی۔ ہندوستانی فلالوجی کے ابتدائی قواعد وضع کیے اور زبانوں کی مماثلت کو دیکھ کر ان کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا۔ یہ اصول ان کی کتاب ''مثمر'' میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ لغت کی کتابوں میں بھی جہاں موقع ملتا ہے، وہ قواعد زبان کی بحث میں خاص دلچسپی لیتے ہیں''۔(۲)

خان آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کی لغت کو غیر معیاری سمجھتے ہوئے نئے سرے سے لکھنا شروع کیا۔ ''نوادرالالفاظ'' دراصل ''غرائب اللغات'' کی ہی ایک پختہ و ترقی یافتہ صورت ہے۔ نوادرالالفاظ میں آرزو نے تشریحات و مترادفات کا بغور مطالعہ کیا اور ہانسوی سے مترادف لکھتے وقت (عربی فارسی کے) جو تسامحات ہوئے تھے ان کو درست کر کے لکھا۔ اس کے علاوہ اس لغت میں عربی و فارسی الفاظ کی املاء، تلفظ اور صحت پر جو سوالیہ نشان تھے ان کو صحیح کر کے، پیش کیا۔ نوادرالالفاظ کے مقدمے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے کہا کہ آرزو نے غرائب اللغات کے تمام الفاظ کو نوادرالالفاظ میں لے لیا۔ ان پر اعتراضات بھی کیے اور ان کی صحت اور تلفظ وغیرہ کے مسائل کو حل کر کے پیش کیا۔ مشرقی روایت کے اس حصے میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بنیادی اور پرائمری سطح کی کاوشیں لغت نویسی کے میدان کا احاطہ تو کر رہی تھیں، لیکن ابھی کسی مشرقی ماہر زبان نے اردو (ہندوستانی) کی گریمر مرتب کرنے کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ (اٹھارہویں صدی کی پہلی دہائی میں انشاء اللہ خاں انشاء نے پہلی مرتبہ اردو گریمر لکھی جو 'دریائے لطافت'' کے نام سے منظرِ عام پر آئی)۔

خان آرزو سے آگے بڑھیں تو شاہ حاتم کا دیوانِ قدیم کا نظرثانی شدہ نسخہ 'دیوان زادہ' کی شکل میں

ایک عملی کام کے طور پر سامنے آتا ہے جس سے اٹھارھویں صدی کے وسط تک کے عرصے کے رجحان کو واضح کرتا ہے۔ شاہ حاتم نے ایہام گوئی کے عروج کے دَور میں اپنی شاعری میں ایہام گوئی کی طرف خاص توجہ دینی شروع کی تھی اور اس ضمن میں دیوان قدیم شائع کیا۔ لیکن جب یہ تحریک دم توڑنے لگی اور شاعری کی زبان میں اصلاح و تبدیلی کی لہریں چلنا شروع ہوئیں تو شاہ حاتم نے بھی صاف گوئی / سادہ گوئی کی راہ اپنائی، اور ایہام کا عنصر شاعری سے نکالنے کا فریضہ شروع کیا۔ شاہ حاتم نے اپنی تخلیقات پر قلم کا نشتر چلایا (جو بہت مشکل ہے اور حوصلے کا کام ہے) اور دیوان کو تنقیدی عمل سے گزارا۔ نتیجتاً ۱۷۵۶ء میں یہ دیوان کانٹ چھانٹ کے بعد ''دیوان زادہ'' کے نام سے دوبارہ منظرِ عام پر آیا۔ شاہ حاتم کا یہ عمل اس بات کا مظہر تھا کہ ہندوستانی زبان بہت جلد اس خلا کو پر کرنے کے لئے خاص اہمیت اختیار کر لے گی جو آنے والے عہد میں فارسی کے زوال کے نتیجے میں بنے گا۔ چنانچہ انہوں نے بدلتے وقت کی رفتار اور رُخ کو سمجھا اور زبان اردو کی اصلاح اور عملی نمونوں کی طرف توجہ دی۔ تبسم کاشمیری اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''شاہ حاتم نے اردو شاعری کا سنہرا دَور یعنی میر سودا کا دَور شروع ہونے سے قبل ہی اردو زبان کی لسانی ہیئت کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے زبان سے نامانوس اور غریب الفاظ وتراکیب کو متروک قرار دے دیا۔ اسی اعتبار سے شاہ حاتم پہلے شاعر ہیں جنہوں نے تخلیقی تجربے میں زبان کی قدر و قیمت کو شدت سے محسوس کر کے اس کی تہذیب واصلاح کا عملی طور پر مظاہرہ کیا تھا''۔(۷)

شاہ حاتم سے لے کر ناسخ کے عہد تک اردو زبان بہت سی تبدیلیوں سے گزری اور یہ تبدیلیاں کسی دبستان میں اصلاح سمجھی گئیں اور کہیں تخریب کا عمل محسوس کی گئیں، لیکن آج کے دَور میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عہد میں جو تبدیلیاں فطری یا غیر فطری طور پر اردو زبان میں ہوئیں، زبان کا وہی نمونہ آج اکیسویں صدی میں پاکستان میں معیار کا درجہ پا چکا ہے۔ اردو ادب کی اولین تاریخ لکھنے والے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

> ''(شاہ حاتم) تصفیۂ زبان کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیے۔ درستی زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ذوق اور آتش وناسخ کے زمانہ میں ایک سو برس بعد پورا ہوا، اس کی داغ بیل شاہ حاتم نے ڈال دی تھی۔۔۔ درستی اور اصلاح زبان کا خیال سب سے پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا''۔(۸)

اوپر کے دونوں اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے شاہ حاتم ان اولین ادیبوں میں سے تھے، جنہوں نے نہ صرف 'دیوان زادہ' کے دیباچے میں اصلاح کے اصول وضابطے مقرر کر کے لکھے بلکہ عملی اقدام کے تحت اپنی شعری تخلیقات کو قلمزد کر کے 'دیوان زادہ' کے روپ میں نئے تبدیلیوں کا نمونہ پیش کر دیا۔ غرض اس عہد سے آگے چل کر

برصغیر میں مشرقی ادیبوں نے زبان کے روپ میں جو تبدیلیاں لانا شروع کیں، ان کی ابتداء شاہ حاتم نے دیوان زادہ کی صورت میں کی تھی۔شاہ حاتم اوراس کے معاصرین کے عہد میں اردو زبان عہد ولی کی زبان سے زیادہ صاف ہو گئی تھی۔لیکن ابھی تک اس میں ہندوی کی جھلک ملتی تھی۔یعنی ابھی شاعری کی زبان سے ہندی پن مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ہندی پن آنے والے عہد میر سودا کے دَور کی عطا ہے جب اردو زبان کا مکمل ترقی یافتہ روپ سامنے آیا۔گو اس میں بھی قدیم ہندی جھلکیاں موجود ہیں۔مگر مجموعی سطح پر زبان کا مطالعہ کریں تو ایک بدلی ہوئی فضا اور مکمل طور پر تبدیل ہوئی اردو زبان ملتی ہے۔اصلاً اس کو اردوئے معلیٰ کا دَور قرار دیا جا سکتا ہے۔

چلتے چلتے زبان کی اصلاح کا بیڑا امام بخش ناسخ تک پہنچتا ہے۔امام بخش ناسخ کے ہاتھوں زبان اردو ایک تکلیف دہ اصلاحی عمل سے گزر کر آگے چلی۔ ناسخ زبان کے معاملے میں اسم با مسمّٰی ثابت ہوئے اور زبان کو کڑے اصلاحی عمل سے ایسے گزارا کہ غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کو بھی یہ عمل متشددانہ محسوس ہونے لگا۔ ناسخ کے ہاتھوں اردو زبان سے وہ مقامی، پراکرتی، ہندی الفاظ بھی چھین لیے گئے جو فطری انداز سے اس زبان کا حصہ بن چکے تھے۔ یہ زبان لکھنؤ کے پرتکلف، آراستہ و پرشکوہ اسلوب کی آئینہ دار ہے۔اصلاحِ زبان کے لکھنوی دور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں زبان میں عربی فارسی الفاظ ومحاورات، تراکیب کا دخول بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ایسے بیش تر ہندی، پراکرتی الفاظ کو بیک جنبش قلم اردو سے نکال باہر کیا جائے کہ جن کی موجودگی سے زبان اردو کی خوبصورتی میں کوئی قدغن نہیں ٹھہرتی تھی بلکہ زبان کا دامن ان کی موجودگی میں زیادہ وسیع تھا۔ان الفاظ کو نکالا جانا بہت ضروری نہ تھا۔ لکھنؤ کی عوامی بول چال پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات انوکھی ہے کہ وہاں کے عوام جیسے مشکل عربی فارسی الفاظ وتراکیب اپنی روزانہ کی بات چیت میں استعمال کرتے تھے ویسے الفاظ ہندوستان کے باقی شہروں کے خواص بھی اپنی زبان میں استعمال نہیں کرتے تھے۔ بعض ناقدین نے اس کو منفی لسانی تحریک بھی کہا ہے۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''ولی نے جس اجتہاد کی ابتداء کی تھی، اس کا نقطہ انجام ناسخ ہے۔اس نے دہلی اور لکھنو کی زبانوں کو ان کے مزاج کے مطابق تقسیم کیا۔طریقہ قدیم کو بدل کر فصاحت اور بلاغت کے اصول فارسی قواعد وضوابط کے مطابق وضع کیے۔۔۔ناسخ کی تحریک کا قبیح پہلو یہ ہے کہ مقامی پراکرتوں کے وہ الفاظ جو عرصے سے اردو زبان کا فطری حصہ بن چکے تھے، عمل تنسیخ کی زد میں آ گئے اور ان کی جگہ عربی فارسی کے مشکل، پیچیدہ اور ادق الفاظ کو شعوری طور پر اردو زبان میں شامل کر دیا گیا۔ چنانچہ اردو جو اپنی سادگی، نرمی اور سلاست کی بناء پر عوام میں مقبولیت حاصل کر رہی تھی، مشکل گوئی کی راہ پر گامزن ہو گئی۔ اس لحاظ سے بیشتر ناقدین نے ناسخ کی اس تحریک کو منفی لسانی تحریک شمار کیا ہے اور اس عہد کی شاعری کو لفاظی کا کھوکھلا انبار کہا ہے''۔(۹)

ان شاء اللہ خان انشاء لکھنؤ کے اس ماحول میں منفرد ادیب کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ انشاء نے 'دریائے لطافت' کے عنوان سے اردو زبان کی پہلی گریمر لکھی، جو کسی بھی مشرقی ادیب کی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ قواعد سے ہٹ کر دیکھیں تو انشاء نے ''رانی کیتکی کی کہانی'' کے عنوان سے ایک داستان لکھی، جس میں کوشش کی کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا داخل نہ ہو۔ اس کاوش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ لکھنؤ کے عہد کی لسانی و اصلاحی کوششوں کا ذکر مختصر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں اس عہد نے اردو زبان کو کچھ نئے شیڈز عطا کیے اور ارتقائے زبان میں اپنا حصہ شامل کیا۔ اسی عہد میں دہلی میں ''عجائب القصص'' کے عنوان سے لکھی گئی داستان پر لسانی تحقیق کی جانی چاہیے۔ یہ داستان شاہ عالم ثانی کی تخلیق تھی جو مغلیہ سلطنت کا حکمران گزرا ہے۔

(۲)

برصغیر کے لسانی منظر نامے میں اب مغرب سے آئے ہوئے لسان وادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی ان کاوشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کی تحریروں اور عملی کاوشوں سے ہندوستانی زبان میں وہ نمونہ سامنے آتا ہے جو آنے والے افراد کے نوآبادیاتی مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی سے قبل ہی ہندوستان میں مختلف وجوہات کی وجہ سے مختلف اقوام مغرب آ چکی تھیں۔ ان میں پرتگالی، ولندیزی (ہالینڈ کے لوگ) فرانس، انگلستان، جرمنی اور ڈنمارک کے افراد شامل تھے۔ لیکن برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی بہتر حکمت عملی، سازگار ملکی حالات اور عسکری قوت کے رکھنے کے باعث اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے کافی علاقوں میں پھیلنا اور پھولنا شروع ہو گئی۔ ۱۶۰۰ء میں لندن کے بے شمار تاجروں نے اپنے شہنشاہ کی اجازت سے ہندوستان کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی منظوری حاصل کر لی تھی اور کنگ جیمز اوّل کی سفارش پر شہنشاہ ہند جہانگیر سے ایک وفد کیپٹن ہاکنز کی صدارت میں ملا اور ہندوستان میں آزاد تجارت کی اجازت طلب کی۔ جہانگیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت کی اجازت دے دی۔ (بعد میں یہ اجازت منسوخ کر دی گئی تھی)۔ سورت میں اس اجازت کے نتیجے میں ہی پہلی تجارتی فیکٹری بنائی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ مشرقی ساحل پر شمالی سرکارز (Northern Sarkars) غالب ہوتی چلی گئیں اور کمپنی قابض اور مضبوط ہوتی چلی گئی۔

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی نے احساس دلایا تھا کہ اب بنگال کے صوبے کے وہ مالک نہیں رہے اور طاقت کا محور انگریزوں کی طرف منتقل ہونے جا رہا تھا۔ شروع شروع میں کمپنی اور اس کے ملازمین کے لیے تجارتی مقاصد کے تحت مقامی زبانوں کی تحصیل کی ضرورت محسوس کی گئی جو آئندہ دَور میں حکمرانی اور مشنری مقاصد کے لیے ضروری خیال کی گئی۔ چنانچہ اس عہد میں لسانِ عامہ اور بول چال کے بنیادی وضروری جملے سیکھنے کی طرف مغربی افراد کا رجحان

ہوا۔ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جون جوشوا کیٹلر اوران کے ہم عصر بنجمن شلزے کی قواعداور بائبل کے تراجم، جارج ہیڈلے کی لسانی کاوشیں، غیر ملکیوں کو مشرقی لسانی روایت سیکھنے سکھانے میں معاون بنیں۔اس عہد کے مستشرقین نے آنے والے عہد کے اردوقواعد ولغات نویسوں کے لیے رستہ ہموار کیا۔فرگوسن کی لغت، لی بی ڈف کی قواعداور ولیم جونز کی مشرقی زبانوں کے متون کے مطالعے کی کاوشیں اور جان گلکرسٹ کی قواعد ولغات کے معیاری نمونے دراصل مذکورہ بالا افراد کی کاوشوں کی وجہ سے معیاری بنے۔

مستشرقین اور بالخصوص انگریز قوم کے سفارت کاروں، تاجروں، مشنری پادریوں اور سیاحوں نے مقامی لسانی روایت کا بطور خاص مطالعہ شروع کر دیا۔سب سے پہلے سنسکرت کی طرف بھرپور توجہ دی گئی۔زبان کی عوامی اور ادبی ہر دو سطح پر مطالعہ اور تحقیق کا کام شروع کر دیا گیا۔زبانوں کی گرائمر (قواعد نویسی) اورڈکشنری (لغت نویسی) کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی۔عام طور پر کیٹلر کے مخطوطات کی دستیابی سے ہندوستانی گرائمر نویسی کی اولیت کا سہرہ کیٹلر کے سر باندھا گیا ہے۔دوسری طرف ولیم جونز نے سنسکرت اور یورپی زبانوں کے تقابل سے تقابلی لسانیات کا آغاز کیا۔لیکن یہ بات اہم ہے کہ اس طرح کی کاوشیں، ان سے قبل، سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی میں فرانسیسی، جرمن اور دوسری یورپی اقوام کے افراد نے شروع کر دیں تھیں۔انہوں نے سنسکرت کو نہ صرف بطور زبان کے سیکھ لیا تھا بلکہ اس کے گریمر اور لغت کی طرف عملی کام کا آغاز کر دیا تھا۔

جان جوشوا کیٹلر (۱۷۱۸ء۔۱۶۵۹ء)(Joan Josua ketelaar)نے ہندوستانی زبان کی صرف ونحو پر ایک کتاب(Instructie of onderwysinghe der hindoustanee en perfiaanfetaaten)‘مرتب کی۔ ۔یہ اردو زبان کی پہلی گریمر تھی (۱۰)۔وہ ہالینڈ کا باشندہ تھا۔کیٹلر نے یہ کتاب ۱۶۹۸ء میں لاطینی زبان میں مرتب کی تھی۔(مولوی عبدالحق نے اس کا سنِ اشاعت ۱۷۱۵ءلکھا ہے) ڈیوڈمل (David Millius) نے ۱۷۴۳ء میں اس گریمر کو ’ہندوستانی گریمر‘کے نام سے انگریزی ترجمہ کر کے شائع کرایا۔وہ Utre cht University میں Theology کے پروفیسر تھے۔ڈیوڈ نے ہی کیٹلر کو یورپ میں متعارف کرایا۔اس کتاب کے تین قلمی نسخے موجود ہیں۔ڈاکٹر غلام عباس گوندل اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں،

> ’’بلاشبہ بھاٹیا اور ماشیڈا کی کاوش انتہائی قابلِ قدر ہے لیکن اس ضمن میں اہم ترین پیش رفت عہدِ حاضر کی مستشرق اور ہمالیہ سٹڈیز کی ماہر ایک خاتون انا پیٹلووانی (anna pytlowany) کی ہے ۔رواں برس انٹرنیٹ پر Utrecht university کی ویب سائٹ پر اس کی تحقیقات پر

مبنی مضمون The Earliest Hindustani Grammar کے عنوان سے شائع ہوا۔اس مضمون کو اہم ترین پیش رفت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں کیٹلر کی قواعد کے نسخہ ہیگ کے واحد قلمی نسخہ ہونے کو رد کیا گیا اور لکھا کہ اس کتاب کا ایک نہیں بلکہ تین تین قلمی نسخے موجود ہیں۔(۱۱)''

اس کتاب کا وہ نسخہ جو نیشنل آرکائیوز، ہیگ جرمنی میں موجود ہے اسکی رو سے اس میں ترپین ابواب ہیں۔ یہ نسخہ ۱۶۹۸ء میں لکھنو میں لکھا گیا تھا۔ دوسرا نسخہ فاؤنڈیشن کسٹوڈیا لائبریری، پیرس (فرانس) میں موجود ہے۔ یہ ۱۷۱۴ میں آگرہ میں لکھا گیا تھا۔ تیسرا نسخہ یوٹریچٹ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے(۱۲)۔کیٹلر کی گریمر اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ یہ اس عہد میں مرتب ہوئی جب اردو شاعری کی روایت دکن سے دہلی میں داخل ہورہی تھی۔ یعنی کیٹلر کے لیے بطور سیاح اور سفارت کار جو زبان بالکل نئی تھی وہ شاعری کے طور پر شمالی ہند کے لوگوں کے لیے ادبی لحاظ سے نئی چیز تھی۔(یہ زبان ریختہ کہلائی)۔

کیٹلر کی اس گرائمر میں اس ضرورت کو بھی مدنظر رکھا گیا کہ دفتری امور اور سفارتی امور سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ زبان اختیار کرنا بہت ضروری ہے جو عوام اور اشرافیہ دونوں سے بات چیت کے لیے مددگار رہو۔ یہ کتاب اس لیے بھی لکھی گئی تھی کہ اس کی مدد سے فیکٹری کے بدیسی ملازمین اور کمپنی کے انتظامی و سیاسی معاملات میں یہ کتاب معاونت حاصل ہو۔اس کتاب کے ترپین ابواب ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کیٹلر نے اس کتاب میں زباندانی سے متعلق ان تمام امور کو مدنظر رکھا ہے جو اس کو فیکٹری کی انتظامی ضرورتوں، سفارتکاری کے امور اور تجارتی امور کی انجام دہی کے لئے پیش آئے۔ وہ سورت میں ایک فیکٹری میں کلرک سے لے کر ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہا۔ تجارتی ضروریات کے لئے اس نے مغل بادشاہ جہاندار شاہ کے دربار میں بھی حاضری دی تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مزید رعائتیں دلوائی جائیں۔ یہ عنصر اس کو مقامی زبان کی تحصیل کی طرف اس کو لایا۔ مقامی زبان سیکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سورت میں اسے مقامی ملازمین اور ہندو و مسلم آڑھتیوں اور تاجروں سے ملنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر رضیہ نور لکھتی ہیں،

> ''کیٹلر نے ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت لاطینی زبان میں مرتب کیے تھے۔۔۔(یہ) کتاب لاطینی زبان میں ہے، لیکن ہندوستانی (اردو) الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں لکھی گئی ہیں۔ان کے ساتھ ساتھ حروف ہندوستانی جدول میں ہندوستانی الفاظ اردو املا میں درج ہیں۔ان الفاظ کا املا ولندیزی زبان کے مطابق ہے''۔(۱۳)

بنجمن شُلزے (Benjamin Shultze) کی کتاب Gramatica Hindustanica ۱۷۴۵ء میں سامنے آئی(۱۴)۔ شُلزے جرمن باشندہ تھا اور وہ عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت

کا مقصد لے کر آیا۔ برصغیر میں قیام کے دوران ایک پنڈت سے ہندوستانی زبان سیکھی۔تامل کے علاقے میں رہا اس لیے بائبل کا ترجمہ دکن میں بولی جانے والی مقامی زبان میں کیا۔ابواللیث صدیقی نے شلزے کی گریمر پر مدون کردہ کتاب اردو، بہ عنوان ''ہندوستانی گرائمر'' کے تحت شائع کی۔اس کتاب کے شروع میں اس کی وجہِ تالیف بتائی گئی ہے۔شلزے ایک عیسائی پادری تھا جومشنری جذبے کے تحت یہاں آیا۔ شلزے کی اس کے علاوہ بھی تحریریں ہیں جوزیادہ تر مذہبی نوعیت کی ہیں۔اس گرائمر سے ہندوستانی زبان کی گریمر کی روایت کا تسلسل قائم ہوا۔اس گرائمر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شلزے نے ہندوستانی زبان کی معیاری یا ٹکسالی صورت کی بجائے عوامی بول چال کو معیار سمجھ کر گریمر مرتب کی۔شلزے کی گریمر اور زباندانی مذہبی تبلیغی ضروریات اور عوامی زبان کو معیار کا درجہ دیتے ہوئے لکھی گئی۔شلزے کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس کو ہندوستانی زبان کے ساتھ گجراتی،تیلگو، گجراتی زبانوں میں مہارت تھی۔

جارج ہیڈلے(George Hadley) کا نام ایک حوالے کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ہیڈلے برٹش آرمی میں کیڈٹ کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔لیفٹیننٹ اور پھر کپتان بنا۔ہندوستانی زبان سیکھنے کے بعد ۱۷۶۵ء میں گریمر مرتب کرنا شروع کی۔یہ گریمر، Grammatical Remarks on the practical and vulgar dialect of the Indostan language, commonly called Moors language. سے مرتب کی جو لندن سے ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی۔۱۷۷۰ میں لندن کے کسی پبلشر نے اس کتاب کو(۱۵)' A grammar and vacoublary of the Moors Language'' کے عنوان سے چھاپ دیا تھا۔اس کتاب سے ایک استعماری سوچ کے حامل فرد کی ضروریات کے پیشِ نظر مقامی زبان کی گریمر کے اصول لکھے گئے۔لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایک بدیسی فوجی کو مقامی آبادی سے کلام میں کن اصولوں کو سامنے رکھ کر زبان کا استعمال کرنا ہے۔

جون فرگوسن(John Fergusson) نام کا ایک مستشرق بھی اسی دور میں گزرا ہے جو اوپر کے گروپ سے ہٹ کر کام کر رہا تھا۔اس نے ہندوستانی زبان کی ڈکشنری پر کام کیا۔اس کی ڈکشنری کا عنوان A dictionary of the Hindostan Language تھا۔اس کے دو حصے تھے جو ۱۷۷۳ء میں لندن سے شائع ہوئے۔ایک حصہ انگریزی ہندوستانی جبکہ دوسرا حصہ ہندوستانی انگریزی پر مشتمل تھا۔ ہندوستانی انگریزی والے حصے میں اس نے عوام وخواص کی بول چال کے جملے،محاورات اور ضرب الامثال کی کثیر تعداد شامل کی ہے جو ایک نو وارد کو ہندوستانی زبان کی تحصیل میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ڈکشنری کے شروع میں کچھ صفحات

گریمر پر بھی لکھے گئے ہیں۔۔اس کتاب کے شروع میں فرگوسن نے چند جملے لکھے ہیں جو ہمیں اس عہد کے یورپی افراد کے لسانی مزاج اور زبان کی ضرورت واہمیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

> ''فرگوسن نے اپنی اس کتاب کو بادشاہ کے نام معنون کیا ہے اور لکھا ہے کہ برطانوی بحریہ اب یورپ میں سب سے زیادہ طاقتور ہے اور اس کی مدد سے ایشیائی ممالک کو آسانی سے سرنگوں کیا جا سکتا ہے۔اس مقصد کے حصول میں ہمیں جو دشواریاں پیش آئیں گی وہ وہاں کی زبانیں ہیں۔ اگر ہم نے یہ زبانیں سیکھ لیں تو ہم ان ممالک کو ہمیشہ کے لیے اپنے ماتحت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے''۔(۱۶)

کیٹلر، شلزے، ہیڈلے اور فرگوسن کی لسانی اپروچ میں گو مختلف ضروریات کی انجام دہی کے لئے زبان کے استعمالات کا ہی فرق ہے لیکن یہ چار اشخاص اس عہد کے مغربی مزاج اور زبان کی مختلف ضروریات کی عکاسی کرتے ہیں۔کیٹلر کے رویے اور عملی اقدامات ظاہر کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو فیکٹری چلانے کے لیے (تجارتی مقاصد)، مقامی مزدوروں سے بات چیت کی جو ضرورت پیش آتی تھی اس کو سہل بنانے کے لئے یہ گرائمر لکھی گئی۔دوسرا اس کو سفارتی امور انجام دینے کی لئے مغل دربار میں بھی حاضر ہونا پڑتا تھا اس تجربے کو بھی اس نے اپنی تالیف میں شامل کر لیا۔بنجمن شلزے نے مشنری نظریات کے تحت زبان کو عیسائیت کے پھیلاؤ کے لیے معاون بنانے پر زور دیا اور اس کی کتاب اسی مقصد کے لیے لکھی گئی۔ ہیڈلے کا تعلق چونکہ برطانیہ کے عسکری وِنگ سے تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوجی افسر کی ضروریات کہ مقامی آبادی اور مقامی ملازموں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جس انداز میں زبان کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کے تحت اس کی کتاب لکھی۔فرگوسن کی لسانی کاوش کے لیے سلیم الدین قریشی کا مندرجہ بالا اقتباس وضاحت کرتا ہے کہ اگر فوج بالخصوص اور افراد (مغربی) بالعموم ہندوستان پر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یہاں کی مقامی زبانوں کی تحصیل کی طرف بھرپور توجہ دینا ہوگی۔

ہندوستانی زبان اس دَور میں عوامی بول چال کی بہترین سطح پر پہنچ چکی تھی۔ یہاں تک کہ مغل دربار میں بھی اردو / ہندوستانی زبان میں بات چیت عام تھی۔مستشرقین نے اس زبان کو سیکھنے کے لیے آسان بنانا چاہا، اس لیے انہیں اس زبان کی گریمر اور لغات کی ضرورت پڑی۔ یہ عجیب بات تھی کہ انہیں اس مقصد کے لیے اردو میں ایسی کتابیں نہ مل سکیں۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابھی ہندوستان کے عوام کو نہ گریمر کی کوئی خاص ضرورت محسوس کی گئی تھی اور نہ ہی یہ زبان نثر کی زبان بنی تھی البتہ شاعری میں یہ زبان راہ پا چکی تھی۔ چنانچہ گریمر اور لغت کے میدان میں پیش آمدہ دقت سے نمٹنے کے لیے مستشرقین کی کھیپ یہاں آئی جس نے اپنے افراد کی سہولت کے لیے اپنے اپنے ملکوں کی زبان میں صرف ونحو، گریمر اور لغات مرتب کرنا شروع کیں۔اس ضمن میں پرتگالی اس جدید روایت کے بانی

قرار پائے۔صرف ونحو میں ان غیر ملکیوں نے نئی راہیں کھول دیں۔مستشرقین اردوقواعد نویسی کی طرف اہل زبان سے پہلے متوجہ ہوئے اوران میں سے بعض نے اپنے اپنے طورنحووصرف کی کتب مرتب کیں۔

ولیم جانز (۱۷۴۶ء۔۱۷۹۴ء) کا ذکر، اٹھارہویں صدی کے اس سارے منظر نامے میں نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔اس نے ہندوستان آ کر زبانوں کے مطالعے کے میدان میں جدتیں قائم کیں۔اس عہد میں ولیم جانز نے تقابلی لسانیات کی بنیاد ڈالی اور پہلی مرتبہ یہ اہم بات ثابت کی کہ سنسکرت اور کلاسیکی مغربی زبانوں کی اصل کوئی مشترک آریائی زبان ہے۔ولیم جانز ہندوستان میں ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے آیا۔یہاں آ کر اس کو سنسکرت زبان کو دیکھنے سیکھنے کا موقع میسر آیا تو اس نے اس بڑی مقامی زبان کے اشتراک کو یورپ کی بڑی زبانوں میں محسوس کیا۔اس تقابلی مطالعے نے اہلِ ہند کو''تقابلی لسانیات'' سے پہلی مرتبہ آگاہ ہونے کا موقع دیا۔ اس نے پرانی انڈین تہذیب اور ادب میں خاص دلچسپی لینا شروع کی۔ولیم کو اپنے باپ (ولیم نکس جانز) سے مطالعے کی روایت ملی تھی جو ایک ریاضی دان تھے اور نیوٹن کے دوست تھے۔اپنے تحقیقی مقاصد کی انجام دہی کے لئے، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ بھی قائم کی۔

یہ ساری روایت، چلتے چلتے ڈاکٹر جان گلکرسٹ پر پہنچتی ہے۔اوپر کی ساری بحث جان گلکرسٹ کی لسانی خدمات کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔وہ ۱۷۸۳ء میں ہندوستان آیا۔میڈیکل ڈاکٹر کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھرتی ہوا،لیکن سرجن کے فرائض سے نظر ہٹا کر مشرقی زبانوں کے میدان کی طرف چل نکلا۔گلکرسٹ نے یہاں آ کر محسوس کیا کہ بہت جلد ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے سیاہ وسفید کا مالک بن جائے گی۔انگریز افسروں کو ایک نئی زبان کی ضرورت محسوس ہوگی جو کہ ان کے اور عوام کے درمیان تعلق کو مضبوط کرے اور حاکم کو محکوموں پر حکومت کرنے اوران کو سمجھنے میں مدد دے۔ چنانچہ ہندوستانی زبان کی خدمت اور اس زبان میں گرائمر ولغات لکھنے کا کام اپنے کندھوں پر لیا۔گلکرسٹ نے''ہندوستانی فلالوجی'' لکھنے آغاز کیا۔اس سلسلے میں انگریزی ہندوستانی لغت کا پہلا حصہ ۱۷۸۷ء میں چھپا، دوسرا ۱۷۹۰ء میں اور ہندوستانی فلالوجی ۱۷۹۶ء میں سامنے آئی۔گلکرسٹ نے ہندوستانی زبان کے دونوں رسم الخط (عربی فارسی اور دیوناگری) بطور خاص سیکھے۔۱۷۹۶ء میں گلکرسٹ نے 'ہندوستانی گرائمر' شائع کی جس نے اردو گریمر کے میدان میں اپنے بہترین حیثیت کو منوالیا۔جان گلکرسٹ نے اول اول ہندوستانی زبان پر کام شروع کیا تو مقامی ادیبوں کی گریمر اور لغت کے موجود نہ ہونے نے اس کو بے چین کر دیا جس سے اس نے گریمر اور لغت مرتب کرنے کا کام زور وشور سے شروع کر دیا۔

گلکرسٹ نے اشاعتی منصوبوں کے لئے ہندوستان کے بہت سے شہروں کا سفر کیا۔لسانیات پر اس کے

منصوبے نے برٹش حکومت کو اسکی مدد کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ ''ہندوستانی فلالوجی'' کی نام سے چھپا۔ گلکرسٹ نے اپنی گریمر اور ڈکشنری میں خواص کے ساتھ ساتھ عوامی زبان کو معیار مان کر مواد مرتب کیا۔ گلکرسٹ نے ہند میں بولی جانے والی زبانوں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی، پنجابی کو سیکھنے کے لئے شہر شہر سفر کیا۔ لوگوں میں گھل مل کر انکا لہجہ اور تلفظ ذہن نشین کیا اور اس کی مدد سے اپنی تالیفات کو مرتب کیا۔ اس نے ۱۷۹۸ء میں کلکتہ میں مقامی زبانوں کی تدریس کے لئے ''اورینٹل سیمینری'' جیسا ادارہ بھی قائم کیا۔ یہ ادارہ آگے چل کر فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی زبانوں کے شعبے کی بنیاد بنا۔

اس دَور میں مقامی روایت کے متوازی مغربی روایت چل رہی تھی جس میں ہندوستانی زبان کو غیر ملکی زبان کے طور پر پڑھا لکھا اور سمجھا جا رہا تھا۔ اس لیے ایسا مواد مرتب کیا جا رہا تھا کہ اس غیر ملکی زبان کی ساخت کو سمجھا جا سکے۔ ابتداء میں یہ کام سست روی سے ہوا اور زیادہ لوگ اس طرف نہیں آئے تھے لیکن اٹھارہویں صدی کے آخری ربع میں سنجیدہ مستشرقین اور توانا روایت سامنے آئی جس نے اس میدان میں تحقیقی واشاعتی سلسلے کو تیز کر دیا پہلے کاروباری اور مذہبی ضروریات کے لیے جس زبان کو سمجھنے کا کام سست روی سے جاری تھا اس عہد میں آ کر انتظامی امور کے لیے بالخصوص اور روح مشترق کو سمجھنے کے لیے لغت و قواعد کے ساتھ ساتھ ''مکالمات'' (dialogues) پر کتابیں لکھی جانا شروع ہوئیں۔ اس عہد میں مقامی روایت کا رُخ ادب اور معیاری زبان کی طرف تھا جبکہ مستشرقین کا رُخ زبان کے عوامی روپ کی طرف تھا۔ لیکن مغربی افراد کا مطمع نظر خالص لسانیاتی تھا جس میں زبان کا میکانکی وافادی پہلو اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ ان مستشرقین نے اولاً ضرورت کے لیے زبان (مقامی) کو اختیار کیا۔ ثانیاً انتظامی ضروریات زبان کی طرف دلچسپی کی وجہ بنیں۔ ثالثاً ہندوستانی زبان کی تحصیل کو مشرقی ذہن کو سمجھنے کے لیے اس زبان کو بطور Tool استعمال کیا گیا۔ زبانوں کے سلسلے میں یہ عملی ولسانی اقدامات فورٹ ولیم کالج پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ زبان ہندوستان / ہندوستانی زبان یا اردو زبان اس کو جو بھی نام دیں، فورٹ ولیم کالج میں آ کر ایک مضبوط اور توانا ادبی روایت کی نہ صرف امین بنی، بلکہ بطور زبان بھی ترقی کے اس خاص مقام پر جا پہنچی کہ نثری ادب کے لیے اس کو افتخار کے ساتھ پیش کیا گیا۔ چنانچہ ''باغ و بہار'' ایسا شاہکار نثری نمونہ سامنے آتا ہے جو سادہ وسلیس اسلوب اور عوامی بول چال کی بہترین تصویر بنتا ہے۔ اب ایک اور امر پیش نظر رہے کہ یہی عوامی لب و لہجہ دہلی سے دور اکبرآباد میں نظیر اکبرآبادی کے پاس شعری تخلیقات میں موجود تھا، جسے اس عہد کے لسانی معیارات پر پورا نہ اُترنے کی صورت میں مشرقی نقاد رَد کر چکے تھے۔

باغ و بہار کے اسی روپ کو فورٹ ولیم کالج میں جان گلکرسٹ نے لاگو کر کے زبان کا شاندار ادبی روپ

دریافت کیا جو آگے چل کر معیاری اردو اسلوب کی پہچان بنا۔ابتدا میں ہندوستانی زبان یورپی افراد کی تجارتی ضرورت تھی۔پھر سفارتی ضرورت بنی۔۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے بعد،جبکہ انگریز عملی طور پر بنگال کے حاکم بن گئے ،تو یہ زبان عسکری ضرورت بن کر سامنے آئی۔یہی زبان ۱۹ویں صدی میں دفتری و علمی ضرورت بنتی چلی گئی۔شروع میں انگریزوں نے ہندوستانی زبان کو فارسی کے مقابل کھڑا کیا۔۱۸ویں صدی میں اصلاحِ زبان کے نام پر کیئے گئے اقدامات آنے والے عہد کے اردو ہندی تنازعے کی بنیاد بنا چکے تھے،چنانچہ اس کا فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے ہندوستانی زبان کو اردو اور ہندی کے روپوں میں لکھے اور تقسیم کیے جانے کی حوصلہ افزائی کی تو ہندوستانی کے بطن سے ''اردواور ہندی'' کے الگ ناموں سے ایک ہی زبان کے دو روپ بنتے چلے گئے،جو آج دو الگ زبانیں سمجھے جاتے ہیں۔ایسی الگ زبانیں،جن کی عمارت کی بنیاد ایک گرائمر پر کھڑی ہوئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زور، محی الدین قادری، ہندوستانی لسانیات، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۶۱ء ص ۴۶۔۱۴۵
۲۔ رضیہ نور محمد، ڈاکٹر، مس، اردو زبان وادب میں مستشرقین کی علمی وادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، لائن آرٹ پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۵ء ص ۱۲
۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، جلد دوم، ص ۱۵
۴۔ ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف)، اردو سائنس بورڈ، لاہور، طبع دوم، ص ۲۵
۵۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اردو، (ترجمہ: حسن عسکری) مطبع منشی نول کشور لکھنو س۔ن۔ ص ۸۲۔۸۱
۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مقدمہ 'نوادر الالفاظ' مشمولہ 'اردو لسانیات'، ڈاکٹر نعمت الحق ص ۵۸
۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۲۶۷
۸۔ رام بابو، سکسینہ، ۔۔۔ص ۸۹۔۸۸
۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص ۲۱۱
۱۰۔ ☆ کیٹلر سے قبل مسٹر کورچ کی مرتب کردہ ''اورینٹل کیٹلاگ'' کا ذکر ملتا ہے۔ گریرسن نے 'لسانیاتی جائزہ ہند' میں بھی ایسے ایک قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے جو ۱۶۳۰ء میں سورت میں لکھا گیا تھا لیکن اس کتاب کا صرف ذکر سننے میں ملتا ہے۔ کتاب کا اصل نسخہ مفقود ہے۔
۱۱۔ غلام عباس گوندل، ڈاکٹر، کیٹلر کی قواعد، کچھ نئی دریافتیں، مطبوعہ معیار، تحقیقی وتنقیدی مجلّہ، شمارہ ۸، بین الاقوامی اسلام آباد، ص ۱۷۰
۱۲۔ URL;http;bc.library.uu.nl/node/180,page title ealriest hindustani grammar/university library Utrecht
۱۳۔ رضیہ نور محمد، ڈاکٹر، اردو زبان ۔۔۔ ص ۱۹۔۱۸
۱۴۔ ☆ مولوی عبدالحق نے ۱۷۴۴ء، عتیق صدیقی نے 'گلکرسٹ اور اسکا عہد' میں ۱۷۴۵ء اور رضیہ نور محمد نے ابواللیث صدیقی کی جامع القواعد سے ۱۷۴۱ء کے سن کو صحیح مان کر اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ ص ۲۰
۱۵۔ سلیم الدین قریشی، اٹھارہویں صدی کی اردو مطبوعات، (توضیحی فہرست)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول ۱۹۹۳ء ص ۳۱
۱۶۔ سلیم الدین قریشی، اٹھارہویں صدی کی اردو مطبوعات (توضیحی فہرست)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اول ۱۹۹۳ء ص ۳۵